دو تاریخی

شاہکار نظمیں

تحقیق تدوین اور تشریح

ڈاکٹر سید تقی عابدی

© جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہے

نام کتاب : دو تاریخی شاہکار نظمیں

مصنف : ڈاکٹر سید تقی عابدی

اشاعت : 2013

ناشر : پرنس آرٹ پرنٹرس، دہلی۔

موبائل : 9136344335,9811008439

کمپوزنگ : عروف انٹر پرائزیز، نئی دہلی، 91-9313675461

ملنے کا پتہ

Dr. Syed Taghi Abedi

1110, Secretariate, Rd. New Market
On. L3X1M4, Canada
e-mail.:taqiabedi@rogers.com

فہرست

			صفحہ نمبر
۱.	انتساب		3
۲.	رو میں ہے رخشِ عمر		5
۳.	وجہ تالیف	سید تقی عابدی	7
۴.	اردو زباں ہماری ہے	سید تقی عابدی	8
۵.	اردو زباں ہماری	مسعود اختر جمالؔ	34
۶.	نظمِ اردو ناطقؔ لکھنوی	سید تقی عابدی	68
۷.	نظمِ اردو	سعید احمد ناطقؔ لکھنوی	78

انتساب

اردو کے حقوق کے پاسبان

قانون دان جسٹس مارکنڈے کاٹجو

کے نام

رو میں ہے رخشِ عمر

نام	:	سید تقی حسن عابدی
ادبی نام	:	تقی عابدی
تخلّص	:	تقی
والد کا نام	:	سید سبط نبی عابدی (مرحوم)
والدہ کا نام	:	سنجیدہ بیگم (مرحومہ)
تاریخ پیدائش	:	یکم مارچ 1952ء
مقام پیدائش	:	دہلی (انڈیا)
تعلیم	:	ایم بی بی ایس (حیدر آباد، انڈیا)
		ایم ایس (برطانیہ)
		ایف سی اے پی (امریکہ)
		ایف آر سی پی (کینیڈا)
پیشہ	:	طبابت
ذوق	:	شاعری، ادبی تحقیق وتنقید
شوق	:	مطالعہ اور تصنیف
قیام	:	ہندوستان، ایران، برطانیہ، نیویارک، کینیڈا

شریکِ حیات: گیتی

اولاد : دو بیٹیاں (معصوما اور رویا)

دو بیٹے (رضا و مرتضیٰ)

تصانیف : (40) شہید (1982) جوشِ مودّت، گلشنِ رویا، اقبالؔ کے عرفانی زاویے، انشاء اللہ خاں انشاؔ، رموزِ شاعری، اظہارِ حق، مجتہد نظم مرزا دبیرؔ، طالع مہر، سلکِ سلامِ دبیرؔ، تجزیہ یادگارِ انیسؔ ابواب المصائب، ذکرِ دُرباران، عروسِ سخن، مصحفِ فارسی دبیرؔ، مثنویاتِ دبیرؔ، کائناتِ نجم، روپؔ کنور کماری، دُربارِ رسالتؐ، فکرِ مطمئینہ، خوشئہ انجم، دُرِ دریائے نجف، تاثیرِ ماتم، نجمی مایا، روشِ انقلاب، مصحفِ تغزّل، ھوالنجم، تعشق لکھنوی، ادبی معجزہ، غالبؔ دیوانِ نعت و منقبت، چوں مرگ آید، رباعیاتِ دبیرؔ، سبدِ سخن، دیوانِ غالبؔ فارسی، فیضؔ فہمی، مطالعۂ دبیر کی روایت، رباعیاتِ انیسؔ۔

زیرِ تالیف: تجزیۂ شکوہ جوابِ شکوہ، فانیؔ لافانی، تجزیہ رباعیاتِ فراقؔ گورکھپوری، اقبالؔ کے چار مصرعے، رباعیاتِ بیدلؔ، باقیاتِ فیضؔ، دیوانِ سلام و کلامِ انیسؔ۔

وجہِ تالیف

اگر چہ تقریباً سو سال قبل اردو ترقی بورڈ کی تشکیل عمل میں آئی لیکن آج اردو تحفظ بورڈ کی ضرورت لاحق ہوگئی ہے۔ ان دو اُردو کی تاریخی تنقیدی اور تاثیری نظموں کے مطالعہ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ساٹھ ستّر سال پہلے اردو کے نبآض اُس کی زندگی توانائی اور ترقی میں درپیش سازشوں اور خطروں کو محسوس کررہے تھے چنانچہ ان نظموں میں یہ بتایا گیا ہے کہ اردو غیر ملکی زبان نہیں اردو کسی خاص مذہب کی میراث نہیں بلکہ اردو تہذیبی، ثقافتی، لسانی اور سماجی آئینہ ہے جس میں برصغیر ہی کے عکس وقتاً فوقتاً منعکس ہوتے رہے۔ ہم نے ضروری تبصرے اور حوالے نظموں کے ساتھ جوڑ دیئے ہیں جن کی تکرار یہاں ضروری نہیں ویسے بھی دونوں نظموں کا حُسنِ بیان واضح ہے تو پھر عیاں راچہ بیاں۔ ہم نے کوشش کی ہے کہ حُسنِ یوسف کو زندانِ مصر سے نکال کر بازارِ مصر میں پیش کریں۔

سید تقی عابدی

فروری ۲۰۱۳ء

ٹورنٹو، کینیڈا

اُردو زبان ہماری ہے

شاعر	:	عبدالحمید
لقب	:	چھوٹے میاں
ادبی نام	:	مسعود اختر (خاندان کے افراد سے چھُپ کر شاعری کرنے لگے اس لئے اپنا نام اور تخلّص جدا کرلیا)
تخلّص	:	جمالؔ
مقام پیدائش	:	بنارس
تاریخ پیدائش	:	معلوم نہ ہوسکی (۱۹۱۰ اور ۱۹۱۵ کے درمیان)
والد	:	محمد کریم (خود شاعر تھے ان کی ادب نوازی، خوش اخلاقی اور فیّاضی کی شہرت تھی)
دادا	:	مولوی محمد سعید۔ سب رجسٹرار (شاعر اور ادب ادب نواز تھے)
جدّ	:	مولوی عبدالقادر خان (سفیر برطانیہ)

تعلیم و تربیت : ا۔ مسعود اختر جمالؔ کو بچپن سے مطالعہ کا شوق و ذوق تھا جو انہیں ان کی تعلیم اور تہذیب یافتہ والدہ سے ملا تھا۔ جب جمالؔ سات سال کے تھے تب ان کی والدہ کا انتقال ہو گیا چنانچہ انھیں بنارس سے جائس بھیج دیا گیا۔

ب۔ جائس میں ابتدائی تعلیم کا آغاز ہوا۔ جمالؔ پھر الہ آباد اور بعد میں رددولی گئے جہاں دو سال تک انگریزی اسکول میں پڑھتے رہے لیکن خاندان والوں کی مسلسل مداخلت سے تنگ آ کر مختلف شہروں میں گھومتے ہوئے علی گڑھ پہنچے اور علی گڑھ کو اپنا ادبی مرکز بنایا اور جلد ہی عمدہ شاعروں کے حلقے میں پہچانے گئے۔ تقریباً ۱۹۳۰ء کے لگ بھگ یہاں ان کی ملاقات مجازؔ سے ہوئی۔ مجازؔ اکتوبر ۱۹۵۳ء کے ہفتہ وار تحریک میں لکھتے ہیں۔ ''مسعود اختر جمالؔ سے میری دوستی آج کی نہیں۔ بیس بائیس سال کی ہے۔ پہلے پہل وہ مجھ سے علی

گڑھ میں ایک طالب علم کی حیثیت سے ملے
تھے اس وقت بھی میں نے ان کے دل میں
اُردو ادب کے بارے میں ایک مخصوص جوش و
خروش اور خلوص پایا تھا۔''

منتخب کلام : جمالؔ کی پہلی نظم جس کی بہت شہرت ہوئی وہ
''صبح بنارس'' تھی۔

دوسری نظم جس نے برصغیر میں انقلاب کیا وہ
''باغی کاترانہ'' تھی۔

اور تیسری نظم جس نے انھیں زندۂ جاوید کر دیا وہ
''اردو زباں ہماری'' ہے۔

اُردو زباں ہماری

آج سے لگ بھگ ساٹھ (۶۰) سال پہلے مسعود اختر جمالؔ نے یہ شاہکار، ادبی، تاریخی اور احساساتی یادگار نظم لکھی جو آج بھی گُل تر کی طرح اُردو ادب کی گُل سر سبد کی حیثیت رکھتی ہے۔ افسوس ہے کہ اس زندۂ جاوید نظم سے اُردو کے عوام ہی نہیں بلکہ خواص بھی نا آشنا ہیں اور ہماری یہ سعی و کوشش اُردو کے پرستاروں کو اس عظیم سرمایہ سے واقف کروانے کی اپج ہے۔ یہ نظم (۶۱) اکسٹھ بندوں پر مشتمل مسدّس کی شکل میں ہے جس کی ادبی، شعری، تاریخی، تہذیبی، جذباتی، سماجی، ثقافتی، لسانی، حقیقی اور مقامی اقدار کے ساتھ ساتھ قادر الکلامی، معجز بیانی، شگفتگی، روانی اور دلکشی اس کے ہر بند میں چمک رہی ہے۔ راقم نے یہ مناسب سمجھا کہ اس سلیس نظم کی تشریح کرنے سے بہتر اس پر کئے گئے مشاہیر شعر و ادب کے ریویو کو پیش کرے تا کہ گلدستۂ نظم کے ہر پھول کے رنگ، شکل، خوشبو اور خصوصیات سے آگاہی ہو سکے۔ اُردو کے مایہ ناز شاعر جگرؔ مرادآبادی قومی آواز، اکتوبر ۱۹۵۲ء میں لکھتے ہیں۔

''اُردو زباں ہماری'' عزیزی مسعود اختر جمالؔ کی فکر پختہ کا تازہ تر کارنامہ ہے۔ انھوں نے بروقت اس نظم کو پیش کر کے تمام ادیبوں کی طرف سے فرض کفایہ ادا کیا ہے۔ وہ قدیم معیاری ادب اور جدید شعورِ ادبی اور رجحانات عامّہ سے نہ صرف یہ کہ پوری طرح باخبر ہیں بلکہ عملاً بھی اُن کی زندگی اور اُن کا کلام ان صداقتوں اور تقاضوں کے آئینہ دار ہیں، تاریخی حقائق و بصائر کو اس جوش بیان روانی اور منطقی استدلال کے ساتھ نظم کرنا آسان بات نہیں لیکن جمالؔ نے اس نظم میں ادبی معیار اور شعری لطافتوں کو پوری طرح ملحوظ رکھا ہے۔ اب یہ فرض ہم سب کے ذمّہ رہ جاتا ہے کہ اس نظم کی اشاعت وسیع تر پیمانے پر کی جائے تاکہ ہندوستان کے عوام اردو زبان کی زندہ علامات سے باخبر ہو کر عملی جدو جہد کی طرف مائل ہو سکیں اور اس طرح اپنی توجہات کا بڑا حصہ صالح اردو ادب کی بقا و احیا کے لئے وقف کر دیں۔''

اُردو غزل و رباعی کے عظیم شاعر فراقؔ گورکھپوری تحریک ہفتہ وار ۱۹۵۳ء میں لکھتے ہیں۔

''بہت سے لوگوں کو یہ بھرم ہو گیا ہے کہ اگر ہندوستان کے ساڑھے چھتیس کروڑ آبادی میں ایک

کروڑ آدمی بھی اُردو میں لکھے پڑھے رہیں تو ہندی ترقی نہیں کر سکتی۔ میرا یہ جملہ ہی ایسے لوگوں کے بے بنیاد خیال کو طشت از بام کر رہا ہے۔ ہمارے دیش میں ہندی کے علاوہ کئی ایسی زبانیں ہیں جن کے پھولنے پھلنے کے باوجود ہندی بھی پھل پھول سکتی ہے۔ پھر ایک اُردو غریب نے کیا خطا کی ہے کہ اگر بھارت کی ایک درجن زبانوں کے ساتھ وہ بھی پھلتی پھولتی رہے تو یہ بات ہمیں ایک آنکھ نہ بھائے۔ اپنے ہاتھ سے اپنے دیش کے کارنامے مٹانا، اپنی زندہ تاریخ کی جڑیں اُکھاڑنا کہاں کا دیش پریم ہے۔ اگر ملک محمدؒ جائسی، سورداس، تلسی داس اور ہندی کے سینکڑوں ہندو مسلمان شاعروں نے وطن کی خدمت کی تو کیا میرؔ، غالبؔ، نظیرؔ اکبر آبادی، آتشؔ، انیسؔ، چکبستؔ، نسیمؔ، رتن ناتھ سرشارؔ اور سیکڑوں اُردو کے ہندو مسلمان سکھ اور عیسائی ادیبوں نے بھارت ماتا کی سیوا نہیں کی۔ میرے عزیز دوست مسعود اختر جمالؔ کی نظم ''اُردو زباں ہماری'' ہماری آنکھیں کھول

دیتی ہے اور اس بات کا جیتا جاگتا احساس اور صحیح اندازہ کرا دیتی ہے کہ اُردو کی دنیا کتنی بھر پور دنیا ہے۔ کیا ہندی سے محبت کے یہی معنی ہیں کہ اُردو کے باغ کو پھونک دیا جائے اور جن سماجی حالات نے میرؔ، غالبؔ اور چکبستؔ کو پیدا کیا۔ وہ حالات مٹا دئے جائیں کہ اس خاکِ ہند سے آئندہ اَمر اُردو ادیبوں کے جانشین نہ اٹھنے پائیں۔ اور ہمارے رنگا رنگ، کلچر کے اس باغ میں خاک اڑنے لگے۔ جمالؔ کی اس خوب صورت نظم کو گھر گھر میں پہونچانا ہر اُس آدمی کا فرض ہے جسے ہندوستان کی تہذیب سے محبت ہے۔''

مشہور انقلابی شاعر اسرار الحق مجازؔ لکھتے ہیں۔

''اُردو کے سلسلہ میں اُن کی نئی طویل نظم ایک شاندار ادبی کارنامہ ہے۔ اس نظم میں اُردو کے ارتقا کی ایک نہایت دلآویز تصویر کشی ملتی ہے۔ جن افراد نے اپنے اپنے دور میں اُردو کے ارتقاء میں حصہ لیا ان کا تذکرہ نہایت خلوص سے کیا گیا

ہے۔ نظم کا حُسن ادبی حیثیت سے مسلّم ہے یہ نظم
اس نوعیت کے لحاظ سے بہت اہم ہے کہ وہ اُردو
کی عظیم تحریک کا ایک جزو ہے۔ جمالؔ نے یہ نظم
لکھ کر اپنا حق ادا کر دیا ہے اور اب ایک اجتماعی
تحریک ہی اُردو کی ترقی کی ضامن ہوسکتی ہے۔''

چرن سرن نازؔ اس نظم کے بارے میں لکھتے ہیں۔

''یہ نظم اُردو ادب کی تاریخ ہی نہیں ہندوستانی لسانی
ارتقاء پر ایک سیر حاصل تبصرہ ہے۔ کالی داس کے
زمانے سے ہندوستان کے عوام کی زبان ہزاروں
قالب بدل کر اُردو کے سانچے میں کس طرح ڈھل گئی
اور کس طرح اُردو زبان عوام کے احساس کی ایک جیتی
جاگتی تصویر بن گئی۔ اس کے بعد مختلف دور میں اُردو
کے ادیبوں نے کس طرح اس کا دامن اپنے جواہر
پاروں سے بھرا اور اس زبان کے ارتقا میں حصہ لیا
اور اسے کنایوں اور استعاروں میں نہایت موثر اور
دلکش پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے۔ یہ نظم ہماری تحریک
کا ایک جزو ہے کیوں کہ ہمارا مقصد ان ادیبوں کے
کارناموں کو زندہ رکھنا ہے جنھوں نے اُردو زبان کی

تعمیر و تشکیل میں اہم حصہ لیا ہے۔''

سید کلب عباس تحریک ہفتہ وار رائے بریلی اکتوبر ۱۹۵۳ء میں لکھتے ہیں۔

''اُردو زباں ہماری'' جیسی نظمیں اس وقت بہت اہمیت رکھتی ہیں، اس لیے کہ وہ بیک وقت دو ضرورتوں کو پورا کرتی ہیں۔ایک زبان اُردو کی ترقی اور دوسرے اس کے تحفظ کی اگر تحفظ کے اقدامات غیر موثر طریقے سے کئے جائیں تو وہ دلنشیں اور مقبول عام نہیں ہوتے۔نظم اور پُراثر نظم سے زیادہ موثر کوئی اور چیز نہیں ہوسکتی۔''

بنارس کالج کے پروفیسر شیوناتھ پانڈے لکھتے ہیں۔

''جمالِ اُردو کی ایک اجمالی تصویر جس کی مصوری حضرت جمالؔ نے اپنے سحر نواز قلم سے کی ہے۔ یہ نظم ایک مختصر تاریخ ہمارے ادب کی ہے۔ موصوف نے نہایت فراخ حوصلگی اور دیدہ ریزی سے بہت سے گمنام شعرا کو زندگی دوام بخشا ہے۔ حضرت جمالؔ کی قدر و منزلت میرے نزدیک بہت بڑھ جاتی ہے

جب میں انھیں مغلوں کی فارسی اور عربی نوازی کے خلاف نفرین کرتے دیکھتا ہوں اور آئندہ زمانے کے لئے زبان اُردو کو عوام کی زبان کی حیثیت سے تسلیم کئے جانے کی خبر دیتے ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں۔

تھے عہدِ مغلیہ میں حالات نا موافق
عمّال سلطنت تھے سب فارسی کے عاشق
اُن کی زباں پہ ہر دم فرہاد و قیس و وامق
جمہور خود مگر تھے اپنی زباں کے خالق

لشکر ہر اک زباں کا سنگم بنا ہوا تھا
اب اک نئی زباں کا آغاز ہو رہا تھا

اس کے بعد جناب جمال مغلوں کی رجعت پسندانہ جذبے کی مذمت کرتے ہوئے عوام کی مرضی کے خلاف ان کوششوں کا مذاق اڑاتے ہیں اور ساتھ ہی واضح انداز میں زبانوں کی ترویج کا حل بھی پیش کرتے ہیں۔

اس کشمکش میں لیکن گھن لگ گیا وطن کو
ترویجِ فارسی کا تھا خبط انجمن کو

ہو سنسکرت رائج یہ فکر برہمن کو
بھاشا میں گفتگو کی خواہش تھی اہلِ فن کو

اہلِ سخن کے دل میں تھی آرزو سخن کی
اُن کے سر شکِ غم سے تھی آبرو سخن کی

جمال کہتے ہیں ہماری آواز اپنے ہی گلشن میں آوازِ صحرا بنی ہوئی ہے اپنی ہی جنم بھومی اور وطن میں اُردو کے ساتھ بیگانگی برتی جا رہی ہے۔ جناب جمال گمراہ نہیں ہونے دیتے اور بلند حوصلگی اور پیہم جدو جہد سے زبان اُردو کو اس کا مناسب مقام دلانے کی تلقین کرتے اور اپنے ساتھ ہمیں بھی حسبِ ذیل عزم دہرانے پر مجبور کرتے ہیں۔

بزدل نہیں کہ ڈر سے میدان چھوڑ دیں گے
دیوِ ستم کا پنجہ اک پل میں موڑ دیں گے
نفرت کا ہر شکنجہ ہم بڑھ کے توڑ دیں گے
ٹوٹے ہوئے دلوں کو الفت سے جوڑ دیں گے

اُردو ہمارا حق ہے ثابت یہ ہم کریں گے
اس کے لئے جئیں گے اس کے لئے مریں گے

مظہر الحق ایڈیٹر اعلان بنارس لکھتے ہیں۔

''جنگ آزادی کی صف اوّل کا شاعر جمالؔ جس کی نظمیں انگریزوں کے لئے تازیانہ تھیں جس کا قلم آگ برسا رہا تھا جس زبان کے دامن کے سایہ میں اُس نے عرصہ تک آزادی کے گیت گائے تھے اس زبان کے ساتھ نا منصفانہ سلوک دیکھ کر ایک بار پھر اسی مجاہدانہ تیور سے اُجاگر ہوا ہے اس مرتبہ جمالؔ نے اپنی زبان کے دامن کا پرچم بنالیا ہے۔ ''اُردو زباں ہماری'' صرف اک نظم نہیں ہے بلکہ ایک سنگِ میل ہے۔ جمالؔ نے اُردو کے متعلق کبھی اس نظریہ سے نہیں سونچا کہ اُردو مسلمانوں کی زبان ہے۔ اُردو زبان مہذب انسانوں کی زبان ہے اس کی تعمیر میں ہندوستان اور ملک کی دوسری قومیں برابر کی شریک رہی ہیں اور آج اس دور ابتلا میں بھی شریک ہیں۔

ع۔ ہر اک زباں کا سنگم اُردو زباں ہماری

جعفر علی خان اثرؔ قومی آواز میں لکھتے ہیں۔

''مسعود اختر جمالؔ صاحب کا مسدّس ''اُردو زباں

ہماری ''نظم ونثر اُردو کی مختصر مگر جامع تاریخ کا ایک
جزو ہے اس پر لطف یہ ہے کہ محض مصرعوں کا مجموعہ
نہیں ہے بلکہ شاعرانہ خوبیوں اور لطافتوں کی وجہ سے
دامانِ گلچین وسبد گل فروش کا مصداق ہے۔زبان اتنی
سہل و سادہ ہے کہ ہر شخص لذت اندوز ہوکر اُردو کی
وسعت و ہمہ گیری کا اعتراف کرے، ہٹ دھرمی کی
بات اور ہے۔''

معین الدین احمد ندوی دارالمصنفین اعظم گڑھ میں لکھتے ہیں۔

''مسعود اختر جمالؔ نے اُردو زبان کی مختصر تاریخ اس
کی خصوصیات اور اُس کے پرستاروں کے جذبات کو
بڑی خوبی اور دلکشی کے ساتھ نظم کیا ہے۔وہ ایک قادر
الکلام شاعر ہیں اس لئے تاریخ اور واقعہ نگاری میں
بھی شعر و ادب کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹا ہے اور
اس کے بعض بند تو ادبی شاہکار کی حیثیت رکھتے ہیں۔
یہ نظم اپنے جذبات و خیالات کے لحاظ سے اُردو کا
ترانہ بنانے کے لائق ہے۔''

محمد حسن لکھتے ہیں۔

''تہذیبی بحران کے اس عہد میں مسعود اختر جمالؔ کی

یہ نظم نئے حوصلے اور خود اعتمادی کی مشعل ہے۔ آج اُردو داں طبقے کو اور ان سب لوگوں کو جنھوں نے جمہوری قدروں کا احترام کرنا سیکھا ہے اگر کسی چیز کی سب سے زیادہ ضرورت ہے تو خود آگاہی اور خود اعتمادی کی انھیں ان کے شاندار ورثے سے آگاہ کرنا اور اُردو کی زندہ شاداب اور متنوع روایات کا احساس دلانا اہم ترین فریضہ ہے۔''

آل احمد سرورؔ قومی آواز میں لکھتے ہیں۔

''یوں تو جمالؔ سے پہلے ناطقؔ لکھنوی نے اُردو کی داستان بڑی چابک دستی سے نظم کی تھی اور اس میں تاریخی واقعات اور شواہد سے مدد لی تھی۔ مگر اپنی تاثیر اور نغمگی، جوش اور روانی میں یہ نظم بھی اپنا جواب نہیں رکھتی۔ اس میں اُردو کی بنیاد اور اُس کی ابتدا اور ارتقاء کا ایک تاریخی اور سماجی تصوّر ملتا ہے اور اُردو کے ادیبوں اور شاعروں کے کارناموں پر بڑے بلیغ اشارے ہیں۔ اُردو میں عوام دوستی جمہور پرستی، انسانیت، رواداری اور تہذیب کی جو روایات

ملتی ہیں ان کا پورا پورا احساس ہی اُردو زبان جس طرح ہمارے مزاج شخصیت، روح اور جذبات کی گہرائیوں کی آواز بن گئی ہے۔ اس کا بڑا دل کش اور پر اثر بیان ہے۔ جمالؔ کے کلام میں جو زور اور جوش، جو بانکپن اور فن کاری ہے، اس میں شراب کی سی مستی اور تلوار کی سی تیزی قدم قدم پر محسوس ہوتی ہے۔ مسدّس بڑی کافر صنفِ سخن ہے۔ اور انیسؔ و اقبالؔ بھی اس سے بہت کچھ کام لینے کے باوجود اس کا پورا پورا حق ادا نہیں کر سکے۔ جمالؔ کو تاریخ، شعر اور نئی زندگی کے مطالبات تینوں سے بیک وقت عہدہ بر آ ہونا تھا اور انھوں نے بڑی خوبی سے اس دشوار گذار وادی کو طے کیا ہے۔''

مرزا عباس بیگ محشرؔ روزنامہ آزاد میں لکھتے ہیں۔

''نظم کو اگر لال قلعہ کے ایوان سے جو اُردو کا گہوارہ تھا تشبیہہ دی جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ سادگی، نفاست، نزاکت، مصوّری، گل کاری، حسن شان، عظمت، پاکیزگی ان میں کون چیز ہے جو اس کے دامن میں

نہیں ہے نظم ایک ادبی شاہکار نہیں معجزہ ہے جو زبان اُردو کی زندگی تک ہمیشہ زندہ رہے گا۔‘‘

مرزا جعفر حسین مدیر نیشن لکھنو لکھتے ہیں۔

’’اُردو زباں ہماری‘‘ ایک نظم ہے جو نہ صرف معنوی بلکہ صوری حیثیت سے بھی بے انتہا دیدہ زیب ہے اور اس کو دیکھ کر ہی اس کی طرف دل کھنچتا ہے، نظم (۶۱) بندوں پر مشتمل ہے۔ مگر جمالؔ صاحب نے اس چھوٹے سے کوزے میں ادبِ اردو کی تاریخ کا سمندر بند کر دیا ہے یہی نہیں کہ اس نظم کو پڑھ کر ہم اُردو شاعروں اور اُردو ادیبوں کے کام سے واقفیت حاصل کر لیتے ہیں، بلکہ جمال صاحب نے یہ تو کمال کیا ہے کہ نہایت مختصر الفاظ میں وہ ہر شاعر کے حسنِ بیان سے بھی ہمارا تعارف کرا دیتے ہیں۔ اس طرح تمام اُردو ادب کے شاعروں کے تذکرے کے بعد موصوف یہ ثابت کرتے ہیں کہ اُردو زبان کس طرح ایک ٹھوس حقیقت ہے جس کو مٹانا ناممکن ہی نہیں بلکہ ملک کے بنے بنائے کلچر کے ساتھ ایک کھلی ہوئی دشمنی ہے۔‘‘

اشتیاق حسین شوق کے مستند مضمون جو روزنامہ آزاد بنارس میں شائع ہوا چند اقتباسات یہ ہیں۔

''اُردو زباں ہماری'' جمالؔ کا تازہ ترین مسدّس پیش نظر ہے۔ عجب حسن اتفاق ہے کہ مسدس ہی ایک ایسا جام ہے جو اقبالؔ، انیسؔ اور حالؔی کی شراب کہنہ کے ساتھ جمالؔ کی مئے دو آتشہ کا حامل ہے۔ یہ نظم مسلسل ایک داستان ہے ایک افسانۂ ارتقا ہے۔ یہ تصوّر شعر کے ذریعہ عوام کے لئے آبِ حیات ہے۔ جمالؔ نے اُردو کی کس مپرسی پر نوحہ نہیں پڑھا۔ جمالؔ کا تصور زبان کے بارے میں یہ ہے

بنتیں نہیں زبانیں یوں سعیٔ ناروا سے
ربط بیان و معنی ہے جہد للبقا سے
ہوتی نہیں ہے بارش لفظوں کی آسماں سے
ماخوذ ہر زباں ہے جمہور کی زباں سے

اور اس تصوّر کا مالک اس زندہ زبان کی تعریف اس طرح کرتا ہے۔

ہندوستاں کے دل کا جذبِ نہاں ہے اُردو
اقوام ایشیاء کا عزمِ جواں ہے اُردو
مشرق کے ارتقاء کا حُسنِ بیاں ہے اُردو
مغرب کے گلستاں کا سروِرواں ہے اُردو

جمالِ اُردو زبان کے معماروں کے نام ہی نہیں گنواتے ہر شاعر اور ادیب کے چہرے کے خدوخال کا سطحی عکس نہیں پیش کرتے بلکہ ان کی ادبی اور لسانی خدمت کا نچوڑ چند الفاظ کی خوشنما تراکیب سے اس طرح پیدا کرتے ہیں کہ ہم یہ سمجھنے پر مجبور ہوجاتے ہیں کہ اس مخصوص فنکار کی خصوصیت کیا تھی۔ میر انیسؔ پر ایک شعر نے وہ کیفیت پیدا کردی جو سینکڑوں نظمیں جواب میں پیش نہیں کر سکتیں۔

نطقِ انیسؔ کیا ہے اک زندہ معجزہ ہے
ظالم حکومتوں پر خاموش تبصرہ ہے

کون اس شعر کو پڑھ کر گرونانک اور کبیر سے استفادہ نہ کرنا چاہے گا۔

نانکؔ کو اس زباں کی دن رات جستجو تھی
ہر دم کبیرؔ کو بھی منزل کی آرزو تھی

حالیؔ، شبلیؔ، آزادؔ، سر سیدؔ اور علاّمہ اقبالؔ پر اس بند کو دیکھئے

حالیؔ کے میکدے کا جامِ صفات اُردو　　شبلیؔ کی انجمن میں قند و نبات اُردو
آزادؔ کے سبو میں آبِ حیات اُردو　　سیدؔ کے ہر نفس میں عرفانِ ذات اُردو

اقبالؔ کی نظر میں انعامِ داوری ہے
معراجِ زندگی ہے رازِ پیمبری ہے

شیومورت لال قیسؔ رائے بریلی کے ہفتہ وار تحریک میں کہتے ہیں:

''اردو زباں ہماری'' اردو زباں کی رزمیہ تاریخ اور اپنی طرح کا ایک نرالا شاہکار و تازہ تر کارنامہ ہے آپ نے اپنی اس نظم میں حسن انداز و حسن و خوبی کے ساتھ اردو ادب کی تاریخ اور ہر دور کے ممتاز شعراء و ادیب کو پیش کیا ہے وہ لطافت ادبی اور شاعرانہ خوبیوں سے خالی نہیں ہے۔''

شجاعت حسین اعظمی 1952ء کے ہفتہ وار تحریک میں لکھتے ہیں:

''جمالؔ ابتدا ہی سے زمانہ کے سرد و گرم کا تجزیہ کر کے ایک باغیانہ فضا پیدا کرتے رہے اُن کی پہلی انقلابی نظم ''باغی کا ترانہ'' اب تک ایک نعرۂ عمل بنی ہوئی ہے۔ اُن کی تمام نظمیں ایک فلسفیانہ استدلال کے

ساتھ ہمیں ارتقا کی منزلوں کی طرف بڑھنے کا پیغام دیتی ہیں۔ جمالؔ جب تک کسی مسئلہ کو اچھی طرح غور وفکر کے ساتھ سمجھ نہیں لیتے اس پر قلم نہیں اُٹھاتے وہ نعرہ باز انقلابی شاعر نہیں ہیں۔ یہ نظم ان کی زندۂ جاوید نظموں میں سے ایک ہے۔''

محمد عبدالباری نائب صدر انجمن ترقّی اردو روزنامہ آزاد بنارس میں لکھتے ہیں:

''اردو زبان ہماری'' دراصل زبان اردو کی آپ بیتی کہانی ہے، جسے ارضِ ہند کے جوان فکر شیریں مقال شاعر مسعود اختر جمالؔ نے عوامی گیت کا روپ دے کر کچھ اس طرح گنگنایا ہے جس سے ہزاروں نغمے برس پڑے ہیں، اور جس کا ہر نغمہ شاعر کی حریت انگیز تخلیقی دیانت اور اس کی غیر معمولی سخنورانہ طرزِ نگارش پر خود ایک بے لاگ اور بے بدل تبصرہ ہے، چمنستانِ اردو کا یہ دلکتا شہ پارہ جہاں شاعرانہ فنکاری کے تمام جمالیاتی تقاضوں سے ہم آہنگ ہے، وہاں شاعر کی یہ کاوش بھی لائق ستائش ہے، اُس نے ''اردو زباں ہماری'' کے ہر شعر کو

حقیقت کا ترجمان بنا کر مورّخانہ انداز کو بدرجہ اتم قائم رکھا ہے، شعر پر شعر پڑھتے جایئے، اس کی دلآویز نغمگی کی تراوش میں ارتقائی دھارے کے صدہا اُبلتے چشمے آپ کو شرابور کرتے ہیں۔ ''حیاتِ اردو'' کا یہ منظوم شاہکار فی الواقع ہمارے ادبی سرمایہ میں ایک بیش بہا اضافہ ہے، نیز اس امر سے بھی کسے انکار ہے، کہ شاعر نے ہر دور کے فنکاروں کو نہ محض ہم سے روشناس ہی کرایا ہے، بلکہ انہیں اپنے اشارات مسیحائی سے زندہ جاوید کر دیا ہے، اور خود بھی زندۂ جاوید ہو گیا ہے۔

اردو کے احیاء بقاء کے لئے ضروری ہے کہ اس کی منظوم سوانح کا ایک ایک شعر عوامی گیت بن جائے، اور ہر زبان سے اردو کے لئے ایسی للکار بلند ہو، جس کے مقابل تمام مخالف آوازیں پست ہو جائیں، اور ہماری محبوب مادری زبان اردو کو اُس کی چھینی ہوئی جگہ پھر واپس مل جائے۔''

اقبال سہیل قومی آواز مورخہ اکتوبر 1952ء میں اس نظم پر تبصرہ کرتے ہوئے بتاتے ہیں:

''عزیزی مسعود جمالؔ سلمہ ملک کے ان نوجوان شعراء میں ہیں جن پر وطن کو بجا طور پر ناز ہے۔ حال میں اُن کی نظم اردو زبان کی حمایت میں دیکھ کر زبان سے بے اختیار صدائے تحسین نکل گئی، تاریخی واقعات اور فلسفیانہ استدلال کو نظم کرنا آسان نہیں ہے، مگر مسعود اختر جمالؔ نے اس نظم میں اپنے ادبی مرتبہ کو قائم رکھا ہے، اور طرز بیان کی دلکشی، بندشوں کی لطافت اور لہجہ کا اعتدال ادبی مرقع کاریوں کے ساتھ جو مسعود اختر جمالؔ کی شاعرانہ خصوصیات ہیں، اس نظم میں بھی برقرار ہیں، میری نظر سے اب تک اردو زبان کے متعلق اتنی مدلّل، متوازن اور ادیبانہ نظم نہیں گزری، اس نظم کی اشاعت ایک لسانی خدمت اور قومی فریضہ ہے۔''

قدیر بنارسی روزنامہ آزاد نومبر 1952ء میں لکھتے ہیں:

'''اردو زباں ہماری' اس عہد کی بہترین تصنیف ہے، یہ نظم صرف اردو زبان کی تاریخ ہی نہیں بلکہ ہندوستان کی منقلب روح قومی جدو جہد اور لسانیات کے ارتقا کی ایک جیتی جاگتی تصویر ہے، جس سے یہ ثابت ہوتا

ہے کہ اردو زبان ہندوستان کی مختلف العقائد جماعتوں کی زندہ علامت ہے، اس قدر خشک اور غیر دلچسپ موضوع پر قلم اُٹھانا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں، لیکن اس نظم کا شاعرانہ انداز بیاں تغزّل کی تمام تر طاقتوں کے ساتھ ایک ادبی کارنامہ ہی نہیں بلکہ ایک معجزہ ہے۔ بعض بعض جگہ تو رمز و کنایہ میں تاریخی واقعات کی منطقی استدلال کے ساتھ اس طرح ترجمانی کی گئی کہ ایک ایک مصرع میں صدیوں کی روح سمٹ آئی ہے۔ انہوں نے یہ نظم لکھ کر بنارس کا نام روشن کر دیا ہے، یہ اردو ادب میں ایک زندہ جاوید اور گراں قدر اضافہ ہے۔"

نومبر 1952ء صغیر احمد صوفی روزنامہ بنارس میں کہتے ہیں:

"تمام ناقدوں اور ادیبوں نے ایک زبان ہو کر اس کی تعریف کی لیکن میرے نزدیک ایک بات اہم ترین ہے اور وہ یہ کہ جمال نے پوری نظم میں غیر متعصّبانہ رویہ رکھا ہے، انہوں نے دیگر زبانوں کی کہیں مذمّت نہیں کی ہے، اردو زبان کی بقا کی جدوجہد میں انہوں نے دیگر زبانوں پر تعصّبانہ تنقید کو

اختیار نہیں کیا اور یہی جذبہ ایسا ہے جس سے ہم ان کے روشن ضمیر ہونے کا دعویٰ کرسکتے ہیں، وہ زندگی میں ایک صحت مند نظریے کے قائل ہیں، جہاں ہر شخص کو اپنی زبان کو پروان چڑھانے کا حق ہوتا ہے، مگر دوسری زبانوں پر حملہ کرنے کا حق نہیں ہوتا، اس کتاب کو لکھ کر انہوں نے بقا کی منزلوں کو چھولیا ہے، اور اردو کی تاریخ جمالؔ کو کبھی فراموش نہیں کرسکتی۔''

علیم مسرورؔ 13 نومبر 1952ء روزنامہ آزاد میں اس نظم پر ریویو کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اردو زباں ہماری 'شاہنامہ اردو ہے' اس نظم میں جمالؔ نے تاریخ ادب اردو کو ایک انوکھے دلکش مگر تحقیقاتی اور سائینسی انداز میں زباں اردو کی بخشی ہوئی قوتِ سخن صرف کر کے پیش کیا ہے اور اس طرح ادب اردو کے حق کی جو گراں باری اُن کے فکر واحساس پر تھی اس سے سبکدوش ہوگئے۔ ہر اردو خواں کا فرض ہے کہ وہ اس نظم کو اپنی تہذیب وتمدّن، علم وحکمت اور حق وفرض کی دستاویز سمجھ کر پڑھے۔''

روشنؔ بنارسی ہفتہ وار تحریک رائے بریلی میں لکھتے ہیں:

''اختر جمالؔ نے ع 'ہر اک زباں کا سنگم اُردو زباں ہماری'' کا نعرہ لگا کر ہر فرقہ کے انصاف پسند انسانوں اور خصوصاً فرقہ پرست ذہنیتوں کو چونکا یا ہے، اور یہ سوچنے پر مجبور کیا ہے، کہ جس طرح اردو زبان سنسکرت، ہندی، فارسی، عربی اور انگریزی زبانوں کا ایک خوشنما سنگم ہے، بالکل اسی طرح اس کے بولنے والے بھی وہ خواہ کسی قوم و مذہب کے ہوں آپس میں ایک دوسرے کی محبت کا سنگم ہیں، اور اتحادِ عمل کی بولتی ہوئی تصویریں ہیں، زبان اردو کو فنا کرنے کی کوشش کرنا سینکڑوں برس کے مختلف العقائد جماعتوں کے اتحاد اور رواداری کی جیتی جاگتی تاریخ کو پُرزے پُرزے کر دینے کے مترادف ہے۔''

''اردو زباں ہماری'' تاریخ ادب کا ایک ایسا مکمل مرقع ہے، جس میں ماضی و حال کے مشاہیر ادب بلاتفریق مذہب اپنے مخصوص اوصاف کے ساتھ ہمیشہ محفوظ رہیں گے، اس نظم کی روشنی میں ''آبحیات'' کی ایسی کتنی ہی پیش بہا تالیفات وتصنیفاتِ عالمِ

وجود میں آئیں گی، جن سے ادبی دنیا جگمگاتی رہے گی، اور جو آئندہ نسلوں کے لئے مشعلِ راہ بنتی رہیں گی، یہ نظم محاسنِ شعرو ادب کا نہایت ہی کامیاب شاہکار ہے، اس میں گنگا کی شوخ روانی، زم زم کی سنجیدہ ثابت قدمی، چاندنی کی لطافت، شہد کی حلاوت، زندگی کا وقار، عزم آہنی کی جھنکار بیک وقت ساری کیفیتیں یکجا نظر آتی ہیں، یوں تو کتنے ہی مدلّل اور تاریخی مضامین اردو پر لکھے گئے، اور وہ سب ہی سپردِ طاق نسیاں ہو گئے، مگر یہ منظومِ تاریخ ادب ''اقبالؔ مرحوم'' کے ترانہ

''سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا''

کی طرح ہر قوم کا اشتراکی ترانہ بنے گی اردو کو چراغِ دیروحرم کے مانند روشن رکھنے میں مدد دے گی۔

اُردو زباں ہماری

(۱)

ہر اک زباں کا سنگم ، اُردو زباں ہماری
تہذیبِ نو کا پرچم ، اُردو زباں ہماری
عکسِ شبابِ عالم ، اُردو زباں ہماری
رعنائی مجسّم ، اُردو زبان ہماری

یہ صبحِ زرفشاں ہے، اک انقلابِ نَو کی
اُردو زباں کرن ہے، اک آفتابِ نَو کی

(۲)

موجِ کمند اس کی ہے اوجِ آسماں پر
سکّہ رواں ہے اس کا، اقلیم دو جہاں پر
ہے اختیار اس کا، دُنیا کی ہر زباں پر
نغمہ سرا ہے اُردو، ہر شاخِ آشیاں پر

یہ وہ بہار ہے جو بیگانۂ خزاں ہے
یہ عطرِ زندگی کی خشبوئے جاوداں ہے

(۳)

یہ مونس و رفیق و دمساز ہے ہماری
تا عرش اس کے دم سے پرواز ہے ہماری
اس کی سخن طرازی ہمراز ہے ہماری
یہ نطق ہے ہمارا ، آواز ہے ہماری

کیا خوف دشمنوں سے، کیا زندگی کا غم ہے
مٹنے نہ دیں گے اس کو جب تک کہ دم میں دم ہے

(۴)

طفلی میں سحر آگیں، دلکش رباب اس کا
جاہ و جلالِ طوفاں ، عہدِ شباب اس کا
امن و امانِ ساحل، پیری میں خواب اس کا
مژدہ حیاتِ نو کا، ہر انقلاب اس کا

بزمِ نشاط میں ہے، یہ جامِ ارغوانی
رزمِ حیات میں ہے، شمشیر کی روانی

(۵)

لشکر کی یہ زباں ہے، کہتے ہیں اس کو اُردو
کیا ہندو و مسلماں، کیا قصۂ من وتو
یہ پھول وہ ہے جس کی ہر سانس میں ہے خوشبو
جو سر پہ چڑھ کے بولے، وہ ہے اسی کا جادو

یہ قول کی ہے پکّی، یہ بات کی دھنی ہے
خنجر کی یہ زباں ہے، نیزے کی یہ انی ہے

(٦)

جوہر ہے یہ خودی کا، جرأت کا یہ نشاں ہے
پیغامِ عصرِ نو ہے، رُودادِ رفتگاں ہے
تصویرِ جامِ جم ہے، آئینۂ جہاں ہے
اُردو زباں ہماری، جمہور کی زباں ہے

جو ہے خمیرِ انساں، وہ آب و گل یہی ہے
سازِ نفس یہی ہے، آہنگ دل یہی ہے

(۷)

بحرِ سخنوری کا ، گوہر یہی زباں ہے
عرفانِ سرمدی کا ، پیکر یہی زباں ہے
شاہینِ آگہی کا ، شہپر یہی زباں ہے
تاریخِ زندگی کا ، محضر یہی زباں ہے

روشن ہوئی اسی سے ، انسانیت کی مشعل
جمہور کی زباں کا ، اُردو ہے نقشِ اوّل

(۸)

اُردو زباں سے پہلے، کیا حال تھا وطن[1] کا
مشکِ سخن سے خالی، نافہ تھا اس ختن کا
پامالِ جورِ گلچیں ، ہر گل تھا اس چمن کا
بے نور ہو چکا تھا، فانوس علم وفن کا

رعنائیاں فضا میں یوں تو برس رہی تھیں
خاموش تھیں زبانیں آنکھیں ترس رہی تھیں

(۹)

نورِ خدا کا پرتو، دنیائے اہلِ زر تھی
پہرا تھا مندروں پر، برہم صفِ بشر تھی
ہر نالہ نارسا تھا، ہر آہ بے اثر تھی
تفسیرِ یاس وحرماں، مزدور کی نظر تھی

زندانِ بیکساں تھا، باغِ وطن ہمارا
جاگیرِ برہمن تھا، ہر علم وفن ہمارا

(۱۰)

عفریت بن کے ہر سو، ڈستے تھے مار وکژدُم
تھا داغ تیرہ بختی کشکولِ ماہ وانجم
اشکوں میں ڈھل گیا تھا، بجھتا ہوا تبسم
تھا رہزنوں کے بس میں، سرمایۂ تکلم

جذبات کے دفینے، دل میں گڑے ہوئے تھے
جمہور کی زباں پر، تالے پڑے ہوئے تھے

(۱۱)

لیکن عوام ۲ اُبھرے ، طوفاں بدوش اُبھرے
باصد وقار اُٹھے ، باصد خروش اُبھرے
باربط وضبط اٹھے ، باہوش وگوش اُبھرے
تقدیر ساز اُٹھے، تدبیر کوش اُبھرے

چھیڑے گئے ترانے ، صحرا میں گلستاں میں
ڈھلتے گئے فسانے ، آسان تر زباں میں

(۱۲)

وہ سنسکرت تھی جو میراث آریوں کی
توقیر ایشیا میں تھی جس کے عالموں کی
افسوس بن گئی تھی روزی وہ پنڈتوں کی
تھی جاہلوں کی صف میں وہ تال اور سُروں کی

اوّل زباں بدیسی ، دوئم عوام دشمن
محنت کشوں کی بیڑی، پونجی پتی کی سُمرن

(۱۳)

قبل از مسیح دیکھو، تاریخ تو اٹھا کر
یونان کا تمدّن ، لایا یہاں سکندر
ایران بھی یہاں سے جاتے رہے سخنور
آتے رہے یہاں بھی تاجر عرب کے اکثر

الفاظ جو گراں تھے، مردہ ہوئے لغت میں
جو چڑھ گئے زباں پر پھیلے وہ شش جہت میں

(۱۴)

بعد از مسیح بھی تھا، یہ میل جول قائم
آخر کو رنگ لایا، یہ ربط وضبط دائم
بن جاتے وہ بھی انساں، ہوتے اگر بہائم
لچکی کمان بن کر جو شاخ تھی ملائم

تھے پرفشاں ہوا میں الفاظ تیر بن کر
آئے جو لب پہ نکلے وہ جوئے شیر بن کر

(۱۵)

اور اس کے بعد آئے اسلام کے پجاری
کی اپنے خونِ دل سے، بھارت کی آبیاری
ہمراہ اپنے لائے اندازِ غم گساری
ہر اک ادا میں ان کی تھا ذوقِ جاں نثاری

گم کردۂ جنوں تھے، منزل کو پا گئے وہ
طوفاں سے لڑتے لڑتے ساحل پہ آ گئے وہ

(۱۶)

وہ صوفیانِ اکرم، وہ رہبرانِ کامل
موجِ نظر سے جن کی، پیدا ہزار ساحل
نقشِ قدم میں جن کے تھیں سیکڑوں منازل
خوش خلقیوں میں کوئی جن کا نہ تھا مقابل

اب تک مزار ان کے ہیں مرکزِ عقیدت
کیا گبر، کیا مسلماں آتی ہے ساری خلقت

(۱۷)

شاہی بھی جن پہ قرباں ایسے فقیر تھے وہ
بچّوں میں تھے وہ بچّے، پیروں میں پیر تھے وہ
روشن دماغ تھے وہ، روشن ضمیر تھے وہ
شیرینیٔ سخن کی، اک جوئے شیر تھے وہ

ہر گفتگو مہذب، ہر بات ان کی پیاری
جمہور کی زباں پر تھا ان کا فیض جاری

(۱۸)

یوں اس زباں میں آئی شیرینیٔ سلاست
پیدا ہوئی سخن میں، رنگینی و فصاحت
الفاظ میں سمائی احساس کی لطافت
فقروں میں رفتہ رفتہ آتی گئی بلاغت

خواجہ [۳]فرید کو تھا عرفان اس زباں کا
سلمان[۴] سعد کو تھا ارمان اس زباں کا

(۱۹)

ارضِ دکن میں اس کا راجو[۵] نے گیت گایا
زینُ ال[۶] نے گفتگو میں کچھ اس کا بھید پایا
خواجہ چراغ[۷] نے بھی فانوسِ دل جلایا
میراںؒ[۸] نے اس زباں میں قصرِ عمل بنایا

گیسو دراز خواجہ[۹] بندہؒ نواز اس کے
قدوسِ[۱۰] عارفاں تھے جویائے راز اس کے

(۲۰)

مخدوم[۱۱] اس کو سمجھے رازِ درونِ فطرت
باجن[۱۲] امین[۱۳] سمجھے، میخانۂ حقیقت
وحدیؒ نے اس کو جانا سرچشمۂ عقیدت
سعدیؒ[۱۴] لٹا رہے تھے، سرمایۂ محبت

جانمؒ[۱۵] نے اس زباں میں دارالحرم بنایا
سیواؒ[۱۶] نے اس زباں میں بیت الصّنم بنایا

(۲۱)

دَورِ[۱۷] قطب میں آکر رفعت نشاں یہ ٹھہری
وجہی[۱۸] نے آ کے ڈالی بنیاد اس کی گہری
سمجھے تھے جس کو گونگی، جانا تھا جس کو بہری
بولی اسی زباں کی ، اب ہو گئی تھی شہری

ارضِ دکن میں گویا بلبل چہک رہی تھی
کلیاں چٹک رہی تھیں، وادی مہک رہی تھی

(۲۲)

فائز[۱۹] ، شعور مرزا ، غواصی و نشاطی
رونق انھیں کے دم سے تھی محفل ادب کی
ظلمت شکن تھے نوری، گوہر فشاں تھی بحری
منزل شناس طالب معجز نما جنیدی

قطبین[۲۰] کا زمانہ، مژدہ بہارِ نو کا
سیلاب پھوٹ نکلا، اک آبشارِ نو کا

(۲۳)

مومنؔ[۲۱] کا طرزِ دلکش، سرنامۂ بتاں تھا
بیچارہؔ[۲۲] شاعروں میں سرتاجِ شاعراں تھا
یعقوبؔ[۲۳] معرفت میں سرخیلِ عارفاں تھا
اقلیمِ دل میں شاہی سردارِ عاشقاں تھا

قرآن و وید و گیتا قالب بدل رہے تھے
سینے میں زندگی کے ارماں مچل رہے تھے

(۲۴)

اَشرفؔ[۲۴] کے لب پہ ہر دم تھا تذکرہ علیؑ کا
آئینہ شاہ میراںؔ[۲۵]، دریائے آگہی کا
ایجادِ ہاشمیؔ[۲۶] تھا، اسلوب ریختی کا
آہنگِ سازِ فطرت، پیغام نصرتیؔ[۲۷] کا

گلرخؔ[۲۸] کو فکر یہ تھی، نظمِ چمن بدل دیں
اَربابِ علم و حکمت طرزِ سخن بدل دیں

(۲۵)

تلسی[۲۹] کے آنسوؤں کا تھا اس طرف اشارا
تھا سورداس[۳۰] کو بھی امید کا سہارا
دل تھا رحیم[۳۱] خاں کا اس غم سے پارا پارا
طوفاں میں جائسی[۳۲] کو ملتا نہ تھا کنارا

نانک[۳۳] کو اس زباں کی دن رات جستجو تھی
ہر دم کبیر[۳۴] کو بھی منزل کی آرزو تھی

(۲۶)

تھے عہد مغلیہ میں حالات ناموافق
عمّالِ سلطنت تھے اب فارسی کے عاشق
ان کی زباں پہ ہر دم فرہاد و قیس و وامق
جمہور خود مگر تھے اپنی زباں کے خالق

لشکر ہر اک زباں کا سنگم بنا ہوا تھا
اب اک نئی زباں کا آغاز ہو رہا تھا

(۲۷)

اس کشمکش میں لیکن گھُن لگ گیا وطن کو
ترویجِ فارسی کا ، تھا خبط انجمن کو
ہو سنسکرت رائج یہ فکر برہمن کو
بھاشا میں گفتگو کی خواہش تھی اہلِ فن کو

اہلِ سخن کے دل میں تھی آرزو سخن کی
ان کے سر شکِ غم سے تھی آبرو سخن کی

(۲۸)

لیکن سخن کا دریا وہ کس طرح بہاتے
اک مُردہ کالبد کو وہ کس طرح جلاتے
بنجر زمین سے کیونکر نخلِ مُراد پاتے
اربابِ علم و دانش کیونکر زباں بناتے

بنتیں نہیں زبانیں یوں سعیِ ناروا سے
ربطِ بیان و معنیٰ ہے جہدِ لِلْبَقَا سے

(۲۹)

ہرگز حکومتوں کی سرحد زباں نہیں ہے
دربارِ سیم و زر کی مسند زباں نہیں ہے
زندہ صداقتوں کا مرقد زباں نہیں ہے
روئے زمیں پہ کوئی مفرد زباں نہیں ہے

ہوتی نہیں ہے بارش لفظوں کی آسماں سے
ماخوذ ہر زباں ہے جمہور کی زباں سے

(۳۰)

القصّہ یہ فسانہ تھا ناتمام اب تک
تھا پردۂ خفا میں حُسنِ دوام اب تک
قالب کو ڈھونڈتی تھی روحِ کلام اب تک
سرگشتۂ سخن تھا ذوقِ عوام اب تک

آخر طلسم ٹوٹا ، دل کا پیام آیا
اَربابِ انجمن کے، ہاتھوں میں جام آیا

(۳۱)

گلشنؔ ۳۴، عزیزؔ، احمدؔ، گجراتیؔ و فراقیؔ
جعفرؔ، حسنؔ، ضیائیؔ، خوشنودیؔ و لطیفیؔ
حشمتؔ، حبیبؔ، سالکؔ، عبدالرحیمؔ و فضلیؔ
محمودؔ اور کاظمؔ، آزادؔ اور فخریؔ

اب ان کی شاعری کا انداز مختلف تھا
اب نغمۂ ولیؔ کا ہر شخص معترف تھا

(۳۲)

کھلتے تھے دل کے غنچے، مضمون کے چمن میں
زینت تھی آبرو سے گنجینۂ سخن میں
رونق سراجؔ سے تھی فانوسِ انجمن میں
ناجیؔ نے روح پھونکی تصویرِ علم وفن میں

احسنؔ کی طبع عالی تھی ہم رکاب گردوں
یکرنگؔ کی غزل میں تاثیرِ چشمِ میگوں

(۳۳)

حاتمؔ کے فیض سے تھا دریا سخن کا جاری
گلبانگِ آرزوؔ سے محفل پہ وجد طاری
تھی بزم رنگ و بو سے مظہرؔ کی میگساری
تاثیرؔ تھی فغاں کی، درمانِ زخم کاری

مخلصؔ کے حوصلے تھے اس راہ کے مسافر
شعلے یقینؔ کے تھے اس بزم کے جواہر

(۳۴)

سوزِ کلیمؔ سے تھا، روشن چراغ اس کا
عاجزؔ کی عاجزی نے پایا سراغ اس کا
ہاشمؔ کے آنسوؤں سے چھلکا ایاغ اس کا
باقرؔ کی گفتگو سے دل باغ باغ اس کا

عزلتؔ کے جذب دل سے، مانوس یہ زباں تھی
راسخؔ کے داغ دل کا، فانوس یہ زباں تھی